تفہیم القرآن

الصافات

(۳)

اور ہم نے موسیٰ و ہارون پر احسان کیا، اُن کو اور ان کی قوم کو کربِ عظیم سے نجات[۷۹] دی، انہیں نصرت بخشی جس کی وجہ سے وہی غالب رہے، ان کو نہایت واضح کتاب عطا کی، انہیں راہِ راست دکھائی، اور بعد کی نسلوں میں ان کا ذکرِ خیر باقی رکھا۔ سلام ہے موسیٰ اور ہارون پر۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں، درحقیقت وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھے۔

اور الیاس بھی یقیناً مرسلین میں سے[۸۰] تھا۔ یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ "تم

---

۷۹ یعنی اس شدید مصیبت سے جس میں وہ فرعون اور اس کی قوم کے ہاتھوں مبتلا تھے۔

۸۰ حضرت الیاس علیہ السلام انبیاء بنی اسرائیل میں سے تھے۔ اُن کا ذکر قرآن مجید میں صرف دو ہی مقامات پر آیا ہے۔ ایک یہ مقام اور دوسرا سورۂ انعام آیت ۸۵۔ موجودہ زمانہ کے محققین ان کا زمانہ ۸۷۵ اور ۸۵۰ قبل مسیح کے درمیان متعین کرتے ہیں۔ وہ جِلعاد کے رہنے والے تھے (قدیم زمانہ میں جلعاد اس علاقے کو کہتے تھے جو آج کل موجودہ ریاست اُردن کے شمالی اضلاع پر مشتمل ہے اور دریائے یرموک کے جنوب میں واقع ہے)۔ بائیبل میں ان کا ذکر ایلیاہ تشبی (ELIJAH THE TISHBITE) کے نام سے کیا گیا ہے۔ ان کے مختصر حالات حسبِ ذیل ہیں:

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے بیٹے رُحُبعام (REHOBOAM) کی نااہلی کے باعث بنی اسرائیل کی سلطنت کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ایک حصہ جو بیت المقدس اور جنوبی فلسطین پر مشتمل تھا، آلِ داؤد کے قبضے میں رہا، اور دوسرا حصہ جو شمالی فلسطین پر مشتمل تھا اس میں ایک مستقل ریاست

اسرائیل کے نام سے قائم ہو گئی اور بعد میں سامریہ اس کا صدر مقام قرار پایا۔ اگرچہ یہ ریاست دونوں ہی ریاستوں کے دگرگوں تھے، لیکن اسرائیل کی ریاست شروع ہی سے ایسے سخت بگاڑ کی راہ پر چل پڑی تھی جس کی بدولت اس میں شرک، بت پرستی، ظلم و ستم اور فسق و فجور کا زور بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ جب اسرائیل کے بادشاہ اخی اب (AHAB) نے صیدا (موجودہ لبنان) کے بادشاہ کی لڑکی ایزبل (JEZEBEL) سے شادی کر لی تو یہ فساد اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ اس مشرک شہزادی کے اثر میں آکر اخی اب خود بھی مشرک ہو گیا، اس نے سامریہ میں بعل کا مندر اور مذبح تعمیر کیا، خدائے واحد کی پرستش کے بجائے بعل کی پرستش رائج کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اسرائیل کے شہروں میں علانیہ بعل کے نام پر قربانیاں کی جانے لگیں۔

یہی زمانہ تھا جب حضرت الیاس علیہ السلام یکایک منظرِ عام پر نمودار ہوتے اور انہوں نے جلعاد سے آکر اخی اب کو نوٹس دیا کہ تیرے گناہوں کی پاداش میں اب اسرائیل کے ملک پر بارش کا ایک قطرہ بھی نہ برسے گا، حتیٰ کہ اوس تک نہ پڑے گی۔ خدا کے نبی کا یہ قول حرف بحرف صحیح ثابت ہوا اور ساڑھے تین سال تک بارش بالکل بند رہی۔ آخر کار اخی اب کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے اور اس نے حضرت الیاس کو تلاش کرا کے بلوایا۔ انہوں نے بارش کے لیے دعا کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ اسرائیل کے باشندوں کو اللہ رب العالمین اور بعل کا فرق اچھی طرح بتا دیں۔ اس غرض کے لیے انہوں نے حکم دیا کہ ایک مجمع عام میں بعل کے پوجاری بھی آکر اپنے معبود کے نام پر قربانی کریں اور میں بھی اللہ رب العالمین کے نام پر قربانی کروں گا۔ دونوں میں سے جس کی قربانی بھی انسان کے ہاتھوں سے آگ لگائے بغیر غیبی آگ سے بھسم ہو جائے اس کے معبود کی سچائی ثابت ہو جائے گی۔ اخی اب نے یہ بات قبول کر لی۔ چنانچہ کوہ کرمل (CARMEL) پر بعل کے ساڑھے آٹھ سو پوجاری جمع ہوئے اور اسرائیلیوں کے مجمعِ عام میں ان کا اور حضرت الیاس علیہ السلام کا مقابلہ ہوا۔ اس مقابلہ میں بعل پرستوں نے شکست کھائی اور حضرت الیاس نے سب کے سامنے یہ ثابت کر دیا کہ بعل ایک جھوٹا خدا ہے، اصل خدا وہی ایک اکیلا خدا ہے جس کے نبی کی حیثیت سے وہ مامور ہو کر آئے ہیں۔ اس کے بعد حضرت الیاس نے اسی مجمعِ عام میں بعل کے پوجاریوں کو قتل کرا دیا اور پھر بارش کے لیے دعا کی جو فوراً قبول ہوئی یہاں تک کہ پورا ملک اسرائیل سیراب ہو گیا۔

لیکن ان معجزات کو دیکھ کر بھی زن مرید اخی اب اپنی بت پرست بیوی کے شکنجے سے نہ نکلا۔ اس کی بیوی ایزبل حضرت الیاس کی دشمن ہو گئی اور اس نے قسم کھائی کہ جس طرح بعل کے پوجاری قتل کیے گئے ہیں، اسی طرح الیاس علیہ السلام بھی قتل کیے جائیں گے۔ ان حالات میں حضرت الیاس کو ملک چھوڑنا پڑا اور چند سال تک وہ کوہ سینا کے دامن میں پناہ گزیں رہے۔ اس موقع پر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے جو فریاد کی تھی اسے بائیبل ان الفاظ میں نقل کرتی ہے:

"بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا اور تیرے مذبحوں کو ڈھا دیا اور تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں"۔

(۱ سلاطین ۱۹: ۱۰)

اُسی زمانہ میں بیت المقدس کی یہودی ریاست کے فرمانروا یہورام (JEHORAM) نے اسرائیل کے بادشاہ اخی اب کی بیٹی سے شادی کر لی اور اس مشرک شہزادی کے اثر سے وہی تمام خرابیاں جو اسرائیل میں پھیل ہوئی تھیں، یہودیہ کی ریاست میں بھی پھیلنے لگیں۔ حضرت الیاس نے یہاں بھی فریضۂ نبوت ادا کیا اور یہورام کو ایک خط لکھا جس کے یہ الفاظ بائیبل میں نقل ہوئے ہیں:

"خداوند تیرے باپ داؤد کا خدا یوں فرماتا ہے: اس لیے کہ تو نہ اپنے باپ یہوسفط کی راہوں پر اور نہ یہوداہ کے بادشاہ آسا کی راہوں پر چلا بلکہ اسرائیل کے بادشاہوں کی راہ پر چلا ہے اور یہوداہ اور یروشلم کے باشندوں کو زناکار بنایا جیسا اخی اب کے خاندان نے کیا تھا اور اپنے باپ کے گھرانے میں سے اپنے بھائیوں کو جو تجھ سے اچھے تھے قتل بھی کیا، سو دیکھ خداوند تیرے لوگوں کو اور تیری بیویوں کو اور تیرے سارے مال کو بڑی آفتوں سے مارے گا اور تو انتڑیوں کے مرض سے سخت بیمار ہو جائے گا یہاں تک کہ تیری انتڑیاں اس مرض کے سبب سے روز بروز نکلتی چلی جائیں گی (۲-تواریخ ۲۱: ۱۲-۱۵)

اس خط میں حضرت الیاس نے جو کچھ فرمایا تھا وہ پورا ہوا۔ پہلے یہورام کی ریاست پر فلستی حملہ آوروں

لوگ ڈرتے نہیں ہو؟ کیا تم بعل[1] کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے ہو، اُس اللہ کو جو

کی تاخت سے تباہ ہوئی اور اس کی بیویوں تک کو دشمن پکڑ لے گئے، پھر وہ خود انتڑیوں کے مرض سے ہلاک ہوا۔

چند سال کے بعد حضرت الیاس پھر اسرائیل تشریف لے گئے اور انہوں نے اخی اب کو، اور اس کے بعد اس کے بیٹے اخزیاہ کو راہِ راست پر لانے کی مسلسل کوشش کی، مگر جو بدی سامریہ کے شاہی خاندان میں گھر کر چکی تھی وہ کسی طرح نہ نکلی۔ آخر کار حضرت کی بد دعا سے اخی اب کا گھرانا ختم ہو گیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دنیا سے اٹھا لیا۔

ان واقعات کی تفصیل کے لیے بائیبل کے حسب ذیل ابواب ملاحظہ ہوں: ۱۔ سلاطین باب ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۱۔ ۲ سلاطین باب ۱۔ ۲۔ ۲ تواریخ باب ۲۱۔

[1] بعل کے لغوی معنی آقا، سردار اور مالک کے ہیں۔ شوہر کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا اور متعدد مقامات پر خود قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ آیت ۲۲۸، سورۂ نساء آیت ۱۲۷، سورۂ ہود آیت ۷۲، اور سورۂ نور آیت ۳۱ میں۔ لیکن قدیم زمانے کی سامی اقوام اس لفظ کو الٰہ یا خداوند کے معنی میں استعمال کرتی تھیں اور انہوں نے ایک خاص دیوتا کو بعل کے نام سے موسوم کر رکھا تھا خصوصیت کے ساتھ لبنان کی فینقی قوم (PHOENICIANS) کا سب سے بڑا دیوتا بعل تھا اور اس کی بیوی عشتارات (ASHTORETH) ان کی سب سے بڑی دیوی تھی۔ محققین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا بعل سے مراد سورج ہے یا مشتری، اور عشتارات سے مراد چاند ہے یا زہرہ۔ بہر حال یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ بابل سے لیکر مصر تک پورے مشرقِ اوسط میں بعل پرستی پھیلی ہوئی تھی، اور خصوصاً لبنان اور شام و فلسطین کی مشرک اقوام بُری طرح اس میں مبتلا تھیں۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلنے کے بعد فلسطین اور شرقِ اردن میں آکر آباد ہوئے، اور توراۃ کے سخت امتناعی احکام کی خلاف ورزی کر کے انہوں نے ان مشرک قوموں کے ساتھ شادی بیاہ اور معاشرت کے تعلقات قائم کرنے شروع کر دیے تو ان کے اندر بھی یہ مرض پھیلنے لگا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفۂ اول حضرت یوشع بن نون کی وفات کے بعد ہی بنی اسرائیل میں یہ اخلاقی و دینی زوال رونما ہونا شروع ہو گیا تھا:

تمہارا اور تمہارے اگلے پچھلے آباو اجداد کا رب ہے"؟ مگر انہوں نے اسے جھٹلا دیا، سو اب یقیناً وہ سزا کے لیے پیش کیے جانے والے ہیں، بجز اُن بندگانِ خدا کے جن کو خالص کر لیا گیا تھا۔[۷۲] اور الیاس کا ذکرِ خیر ہم نے بعد کی نسلوں میں باقی رکھا۔[۷۳] سلام ہے الیاس پر۔[۷۴] ہم نیکی

"اور بنی اسرائیل نے خدا کے آگے بدی کی اور بعلیم کی پرستش کرنے لگے۔۔۔۔ اور وہ خداوند کو چھوڑ کر بعل اور عستارات کی پرستش کرنے لگے" (قضاۃ ۲: ۱۱-۱۳)

"سو بنی اسرائیل کنعانیوں اور حتّیوں اور اموریوں اور فرزّیوں اور حوّیوں اور یبوسیوں کے درمیان بس گئے اور ان کی بیٹیوں سے آپ نکاح کرنے اور اپنی بیٹیاں ان کے بیٹوں کو دینے اور ان کے دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے" (قضاۃ ۳: ۵-۶)

اُس زمانہ میں بعل پرستی اسرائیلیوں میں اس قدر گھس چکی تھی کہ بائبل کے بیان کے مطابق ان کی ایک بستی میں علانیہ بعل کا مذبح بنا ہوا تھا جس پر قربانیاں کی جاتی تھیں۔ ایک خدا پرست اسرائیلی اس حالت کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے رات کے وقت چپکے سے یہ مذبح توڑ دیا۔ دوسرے روز ایک مجمعِ کثیر اکٹھا ہو گیا اور وہ اُس شخص کے قتل کا مطالبہ کرنے لگا جس نے شرک کے اس اڈّے کو توڑا تھا (قضاۃ ۶: ۲۵-۳۲)۔ اس صورتِ حال کو آخر کار حضرت سموایل، طالوت، داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نے ختم کیا اور نہ صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کی بلکہ اپنی مملکت میں بالعموم شرک و بُت پرستی کو دبا دیا۔ لیکن حضرت سلیمان کی وفات کے بعد یہ فتنہ پھر اُبھرا اور خاص طور پر شمالی فلسطین کی اسرائیلی ریاست بعل پرستی کے سیلاب میں بہ گئی۔

۷۲؎ یعنی اس سزا سے صرف وہی لوگ مستثنیٰ ہوں گے جنہوں نے حضرت الیاس کو نہ جھٹلایا اور جن کو اللہ نے اُس قوم میں سے اپنی بندگی کے لیے چھانٹ لیا۔

۷۳؎ حضرت الیاس علیہ السلام کو ان کی زندگی میں تو بنی اسرائیل نے جیسا کچھ ستایا اُس کی داستان اوپر گزر چکی ہے، مگر بعد میں وہ ان کے ایسے گرویدہ و شیفتہ ہوئے کہ حضرت موسیٰ کے بعد کم ہی لوگوں کو انہوں نے اُن سے بڑھ کر جلیل القدر مانا ہو گا۔ اُن کے ہاں مشہور ہو گیا کہ الیاس علیہ السلام ایک بگولے میں آسمان پر زندہ

کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ واقعی وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

اٹھا لیے گئے ہیں (۲ سلاطین باب دوم)، اور یہ کہ وہ پھر دنیا میں تشریف لائیں گے۔ چنانچہ بائیبل کی کتاب ملاکی میں لکھا ہے:

"دیکھو، خداوند کے بزرگ، اور ہولناک دن کے آنے سے پہلے میں ایلیاہ نبی کو تمہارے پاس بھیجوں گا" (۴:۵)

حضرت یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی بعثت کے زمانہ میں یہودی بالعموم تین آنے والوں کے منتظر تھے۔ ایک حضرت الیاس۔ دوسرے مسیح۔ تیسرے "وہ نبی" (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)۔ جب حضرت یحییٰ کی نبوت شروع ہوئی اور انہوں نے لوگوں کو اصطباغ دینا شروع کیا تو یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں نے ان کے پاس جا کر پوچھا کیا تم مسیح ہو؟ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کیا تم ایلیاہ ہو؟ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کیا تم "وہ نبی" ہو۔ انہوں نے کہا میں وہ بھی نہیں ہوں تب انہوں نے کہا اگر تم نہ مسیح ہو، نہ ایلیاہ، نہ وہ نبی، تو پھر تم بپتسمہ کیوں دیتے ہو؟ (یوحنا ۱: ۱۹-۲۶) پھر کچھ مدت بعد جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا غلغلہ بلند ہوا تو یہودیوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ شاید ایلیاہ نبی آگئے ہیں (مرقس ۶: ۱۴-۱۵)۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں بھی یہ خیال پھیلا ہوا تھا کہ ایلیاہ نبی آنے والے ہیں۔ مگر حضرت نے یہ فرما کر ان کی غلط فہمی کو رفع فرمایا کہ "ایلیاہ تو آچکا، اور لوگوں نے اسے نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا" اس سے حواری خود جان گئے کہ دراصل آنے والے حضرت یحییٰ تھے نہ کہ آٹھ سو برس پہلے گزرے ہوتے حضرت الیاس (متی ۱۱: ۱۴ اور متی ۱۷: ۱۰-۱۳)

۷۷ اصل میں الفاظ ہیں سلامٌ علیٰ اِل یاسین۔ اس کے متعلق بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ حضرت الیاس کا دوسرا نام ہے، جس طرح حضرت ابراہیم کا دوسرا نام ابراہام تھا۔ اور بعض دوسرے مفسرین کا قول ہے کہ اہل عرب میں عبرانی اسماء کے مختلف تلفظ رائج تھے۔ مثلاً میکال اور میکائیل اور میکائین ایک ہی فرشتے کو کہا جاتا تھا۔ ایسا ہی معاملہ حضرت الیاس کے نام کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ خود قرآن مجید میں ایک ہی پہاڑ کا نام طور سینا بھی آیا ہے اور طور سینین بھی۔

اور لوطؑ بھی انہی لوگوں میں سے تھا جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یاد کرو جب ہم نے اس کو اور اس کے سب گھر والوں کو نجات دی، سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی[۷۵] پھر باقی سب کو تہس نہس کر دیا۔ آج تم شب و روز اُن کے اُجڑے دیار پر سے گزرتے ہو[۷۶] کیا تم کو عقل نہیں آتی؟

اور یقیناً یونسؑ بھی رسولوں میں سے تھا[۷۷]۔ یاد کرو جب وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلا[۷۸] پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوا اور اس میں مات کھائی۔ آخر کار مچھلی نے اسے نگل لیا اور وہ ملامت زدہ تھا[۷۹]۔ اب اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا[۸۰] تو روزِ قیامت تک اسی

۷۵؎ اس سے مراد حضرت لوط کی بیوی ہے جو ہجرت کا حکم آنے پر اپنے شوہرِ نامدار کے ساتھ نہ گئی بلکہ اپنی قوم کے ساتھ رہی اور مبتلائے عذاب ہوئی۔

۷۶؎ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ قریش کے تاجر شام و فلسطین کی طرف جاتے ہوئے شب و روز اس علاقے سے گزرتے تھے جہاں قومِ لوط کی تباہ شدہ بستیاں واقع تھیں۔

۷۷؎ یہ تیسرا موقع ہے جہاں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ یونس اور سورۂ انبیاء میں ان کا ذکر گزر چکا ہے اور ہم اس کی تشریح کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، صفحہ ۳۱۲-۳۱۳۔ جلد سوم، صفحہ ۱۸۲-۱۸۳)

۷۸؎ اصل میں لفظ اَبَقَ استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں صرف اُس وقت بولا جاتا ہے جبکہ غلام اپنے آقا کے ہاں سے بھاگ جائے۔ "الاباق ھرب العبد من سیدہ" "اِباق کے معنی ہیں غلام کا اپنے آقا سے فرار ہو جانا" (لسان العرب)

۷۹؎ اِن فقروں پر غور کرنے سے جو صورت واقعہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ:

(۱) حضرت یونس جس کشتی میں سوار ہوئے تھے وہ اپنی گنجائش سے زیادہ بھری ہوئی (OVERLOADED) تھی۔

(۲) قرعہ اندازی کشتی میں ہوئی، اور غالباً اُس وقت ہوئی جب بحری سفر کے دوران میں یہ محسوس ہوا کہ

مچھلی کے پیٹ میں رہتا۔[۸۱] آخر کار ہم نے اسے بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینک دیا۔[۸۲]

بوجھ کی زیادتی کے سبب سے تمام مسافروں کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔ لہٰذا قرعہ اس غرض کے لیے ڈالا گیا کہ جس کا نام قرعہ میں نکلے اسے پانی میں پھینک دیا جائے۔

(۳) قرعہ میں حضرت یونس ہی کا نام نکلا۔ وہ سمندر میں پھینک دیئے گئے اور ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا۔

(۴) اِس ابتلا میں حضرت یونس اس لیے مبتلا ہوئے کہ وہ اپنے آقا (یعنی اللہ تعالیٰ) کی اجازت کے بغیر اپنے مقامِ ماموریت سے فرار ہو گئے تھے۔ اِس معنی پر لفظ اَبَق بھی دلالت کرتا ہے جس کی تشریح اوپر حاشیہ ۴۸ میں گزر چکی ہے۔ اور اسی معنی پر لفظ مُلیم بھی دلالت کرتا ہے۔ مُلیم ایسے قصوروار آدمی کو کہتے ہیں جو اپنے قصور کی وجہ سے آپ ہی ملامت کا مستحق ہو گیا ہو، خواہ اسے ملامت کی جائے یا نہ کی جائے۔ یقال قد الام الرجل، اذا اتیٰ ما یلام علیہ من الامر وان لم یُلَم۔ (ابن جریر)

۸۰ اس کے دو مطلب ہیں اور دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام پہلے ہی خدا سے غافل لوگوں میں سے نہ تھے، بلکہ اُن لوگوں میں سے تھے جو دائماً اللہ کی تسبیح کرنے والے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب وہ مچھلی کے پیٹ میں پہنچے تو انہوں نے اللہ ہی کی طرف رجوع کیا اور اس کی تسبیح کی۔ سورۂ انبیاء میں ارشاد ہوا ہے فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ پس اُن تاریکیوں میں اُس نے پکارا "نہیں ہے کوئی خدا مگر تو، پاک ہے تیری ذات۔ بے شک میں قصوروار ہوں"۔

۸۱ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مچھلی قیامت تک زندہ رہتی اور حضرت یونس قیامت تک اس کے پیٹ میں زندہ رہتے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت تک اس مچھلی کا پیٹ ہی حضرت یونس کی قبر بنا رہتا۔ مشہور مفسر قتادہ نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے (ابن جریر)۔

۸۲ یعنی جب حضرت یونسؑ نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور وہ ایک بندۂ مومن و قانت کی طرح اس کی تسبیح میں لگ گئے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مچھلی نے اُن کو ساحل پر اُگل دیا۔ ساحل ایک چٹیل میدان تھا جس میں

اور اُس پر ایک بیلدار درخت اُگا دیا۔[۸۳] اس کے بعد ہم نے اُسے ایک لاکھ، یا اس سے زائد لوگوں کی طرف بھیجا،[۸۴] وہ ایمان لائے اور ہم نے ایک وقتِ خاص تک انہیں باقی رکھا۔[۸۵]

کوئی روئیدگی نہ تھی، نہ کوئی ایسی چیز تھی جو حضرت یونس پر سایہ کرتی، نہ وہاں غذا کا کوئی سامان موجود تھا۔

۸۳؎ اصل الفاظ ہیں شَجَرَةً مِّن يَقْطِينٍ۔ یقطین عربی زبان میں ایسے درخت کو کہتے ہیں جو کسی تنے پر کھڑا نہیں ہوتا بلکہ بیل کی شکل میں پھیلتا ہے، جیسے کدو، تربوز، ککڑی وغیرہ۔ بہرحال وہاں کوئی ایسی بیل معجزانہ طریقہ پر پیدا کر دی گئی تھی جس کے پتے حضرت یونس پر سایہ بھی کریں اور جس کے پھل ان کے لیے بیک وقت غذا کا کام بھی دیں اور پانی کا کام بھی۔

۸۴؎ "ایک لاکھ یا اس سے زائد" کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی تعداد میں شک تھا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ان کی بستی کو دیکھتا تو یہی اندازہ کرتا کہ اس شہر کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہی ہوگی، کم نہ ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ یہ وہی بستی تھی جس کو چھوڑ کر حضرت یونس بھاگے تھے۔ اُن کے جانے کے بعد عذاب آتا دیکھ کر جو ایمان اُس بستی کے لوگ لے آئے تھے اس کی حیثیت صرف توبہ کی تھی جسے قبول کر کے عذاب اُن پر سے ٹال دیا گیا تھا۔ اب حضرت یونس دوبارہ ان کی طرف بھیجے گئے تاکہ وہ نبی پر ایمان لا کر باقاعدہ مسلمان ہو جائیں۔ اس مضمون کو سمجھنے کے لیے سورۂ یونس، آیت ۹۸ نگاہ میں رہنی چاہیے۔

۸۵؎ حضرت یونس کے اس قصے کے متعلق سورۂ یونس اور سورۂ انبیاء کی تفسیر میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس پر بعض لوگوں نے اعتراضات کیے ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دوسرے مفسرین کے اقوال بھی نقل کر دیے جائیں۔

مشہور مفسر قتادہ سورۂ یونس، آیت ۹۸ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "کوئی بستی ایسی نہیں گزری ہے جو کفر کر چکی ہو اور عذاب آجانے کے بعد ایمان لائی ہو اور پھر اسے چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس سے صرف قوم یونس مستثنیٰ ہے۔ انہوں نے جب اپنے نبی کو تلاش کیا اور نہ پایا، اور محسوس کیا کہ عذاب قریب آگیا ہے تو اللہ نے ان کے دلوں میں توبہ ڈال دی" (ابن کثیر، جلد ۲، ص ۴۳۳)

اسی آیت کی تفسیر میں علامہ آلوسی لکھتے ہیں: "اس قوم کا قصہ یہ ہے کہ یونس علیہ السلام موصل کے علاقے میں نینوی کے لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ یہ کافر و مشرک لوگ تھے حضرت یونس نے ان کو اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لانے اور بتوں کی پرستش چھوڑ دینے کی دعوت دی۔ انہوں نے انکار کیا اور جھٹلایا۔ حضرت یونس نے ان کو خبر دی کہ تیسرے دن ان پر عذاب آجائے گا اور تیسرا دن آنے سے پہلے آدھی رات کو وہ بستی سے نکل گئے۔ پھر دن کے وقت جب عذاب اس قوم کے سروں پر پہنچ گیا... اور انہیں یقین ہو گیا کہ سب ہلاک ہو جائیں گے تو انہوں نے اپنے نبی کو تلاش کیا، مگر نہ پایا۔ آخر کار وہ سب اپنے بال بچوں اور جانوروں کو لیکر صحراء میں نکل آئے اور ایمان و توبہ کا اظہار کیا... پس اللہ نے ان پر رحم کیا اور ان کی دعا قبول کر لی" (روح المعانی، جلد ۱۱، ص ۱۷۰)

سورۂ انبیاء کی آیت ۸۷ کی تشریح کرتے ہوئے علامہ آلوسی لکھتے ہیں: "حضرت یونس کا اپنی قوم سے ناراض ہو کر نکل جانا ہجرت کا فعل تھا، مگر انہیں اس کا حکم نہیں دیا گیا تھا" (روح المعانی ج ۱۷، ص ۷۷)۔ پھر وہ حضرت یونس کی دعا کے فقرہ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں: "یعنی میں قصوروار تھا کہ انبیاء کے طریقہ کے خلاف، حکم آنے سے پہلے ہجرت کرنے میں جلدی کر بیٹھا۔ یہ حضرت یونس علیہ السلام کی طرف سے اپنے گناہ کا اعتراف اور توبہ کا اظہار تھا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کی اس مصیبت کو دور فرما دے" (روح المعانی، ج ۱۷، ص ۷۸)

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا حاشیہ اس آیت پر یہ ہے کہ "وہ اپنی قوم پر جبکہ وہ ایمان نہ لائی خفا ہو کر چل دیئے اور قوم پر سے عذاب ٹل جانے کے بعد بھی خود واپس نہ آئے اور اس سفر کے لیے ہمارے حکم کا انتظار نہ کیا" (بیان القرآن)

اسی آیت پر مولانا شبیر احمد عثمانی حاشیہ میں فرماتے ہیں: "قوم کی حرکات سے خفا ہو کر غصے میں بھرے ہوئے شہر سے نکل گئے، حکم الٰہی کا انتظار نہ کیا اور وہ وعدہ کر گئے کہ تین دن کے بعد تم پر عذاب آئے گا ..... انی کنت من الظالمین، اپنی خطا کا اعتراف کیا کہ بے شک میں نے جلدی کی کہ تیرے حکم کا انتظار کیے بدون بستی والوں کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا"

پھر ذرا ان لوگوں سے پوچھو[۸۶]، کیا (تمہارے دل کو یہ بات لگتی ہے کہ) تمہارے

سورۂ صافات کی آیات بالا کی تشریح میں امام رازی لکھتے ہیں: "حضرت یونس کا قصور یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی اس قوم کو جس نے انہیں جھٹلایا تھا، ہلاک کرنے کا وعدہ فرمایا، یہ سمجھے کہ یہ عذاب لامحالہ نازل ہونے والا ہے، اس لیے انہوں نے صبر نہ کیا اور قوم کو دعوت دینے کا کام چھوڑ کر نکل گئے۔ حالانکہ ان پر واجب تھا کہ دعوت کا کام برابر جاری رکھتے، کیونکہ اس امر کا امکان باقی تھا کہ اللہ ان لوگوں کو ہلاک نہ کرے" (تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۱۵۸)

علامہ آلوسی اِذۡ اَبَقَ اِلَی الۡفُلۡکِ الۡمَشۡحُوۡنِ پر لکھتے ہیں: "اِبَق کے اصل معنی آقا سے فرار ہونے کے ہیں۔ چونکہ حضرت یونس اپنے رب کے اذن کے بغیر اپنی قوم سے بھاگ نکلے تھے اس لیے اس لفظ کا اطلاق ان پر درست ہوا۔" پھر آگے چل کر لکھتے ہیں: "جب تیسرا دن ہوا تو حضرت یونس اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نکل گئے۔ اب جو ان کی قوم نے ان کو نہ پایا تو وہ اپنے بڑے اور چھوٹے اور جانوروں، سب کو لے کر نکلے، اور نزول عذاب ان سے قریب تھا، پس انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور زاری کی اور معافی مانگی اور اللہ نے انہیں معاف کر دیا" (روح المعانی، جلد ۲۳، ص ۱۳۰)

مولانا شبیر احمد صاحب وَهُوَ مُلِيۡمٌ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "الزام یہی تھا کہ خطائے اجتہادی سے حکم الٰہی کا انتظار کیے بغیر بستی سے نکل پڑے اور عذاب کے دن کی تعیین کر دی"

پھر سورۂ القلم کی آیت فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ وَلَا تَکُنۡ کَصَاحِبِ الۡحُوۡتِ پر مولانا شبیر احمد صاحب کا حاشیہ یہ ہے: "یعنی مچھلی کے پیٹ میں جانے والے پیغمبر (حضرت یونس علیہ السلام) کی طرح مکذبین کے معاملہ میں تنگ دلی اور گھبراہٹ کا اظہار نہ کیجیے"۔ اور اسی آیت کے فقرہ وَهُوَ مَکۡظُوۡمٌ پر حاشیہ تحریر کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں: "یعنی قوم کی طرف سے غصے میں بھرے ہوئے تھے۔ جھنجلا کر شتابی عذاب کی دعا، بلکہ پیشین گوئی کر بیٹھے"۔

[۸۶] یہاں سے ایک دوسرا مضمون شروع ہوتا ہے۔ پہلا مضمون آیت نمبر ۱۱ سے شروع ہوا تھا جس میں کفار مکہ کے سامنے یہ سوال رکھا گیا تھا "ان سے پوچھو، کیا ان کا پیدا کرنا زیادہ مشکل کام ہے یا اُن

رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور ان کے لیے ہوں بیٹے؟[۴۵] کیا واقعی ہم نے ملائکہ کو عورتیں ہی بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟ خوب سُن رکھو، دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے، اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کرلیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے، کیسے حکم لگا رہے ہو۔ کیا تمہیں ہوش نہیں آتا۔ یا پھر تمہارے پاس اپنی ان باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے، تو لاؤ اپنی وہ کتاب اگر تم سچے ہو۔[۴۶]

چیزوں کا جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں "۔ اب انہی کے سامنے یہ دوسرا سوال پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلے سوال کا منشا کفار کو اُن کی اس گمراہی پر متنبہ کرنا تھا کہ وہ زندگی بعدِ موت اور جزا و سزا کو غیر ممکن الوقوع سمجھتے تھے اور اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑاتے تھے۔ اب یہ دوسرا سوال اُن کی اس جہالت پر متنبہ کرنے کے لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کرتے تھے اور قیاسی گھوڑے دوڑا کر جس کا چاہتے تھے اللہ سے رشتہ جوڑ دیتے تھے۔

۴۵ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں قریش، جُہَینہ، بنی سلمہ، خُزاعہ، بنی ملیح اور بعض دوسرے قبائل کا عقیدہ یہ تھا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ان کے اس جاہلانہ عقیدے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو النساء، آیت ۱۱۷۔ النحل آیات ۵۷-۵۸۔ بنی اسرائیل آیت ۴۰۔ الزخرف آیت ۱۶ تا ۱۹۔ النجم، آیات ۲۱ تا ۲۷۔

۴۶ یعنی ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دینے کے لیے دو ہی بنیادیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو ایسی بات مشاہدے کی بنا پر کہی جا سکتی ہے، یا پھر اس طرح کا دعویٰ کرنے والے کے پاس کوئی کتابِ الٰہی ہونی چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ نے خود یہ فرمایا ہو کہ ملائکہ میری بیٹیاں ہیں۔ اب اگر اس عقیدے کے قائلین نہ مشاہدے کا دعویٰ کر سکتے ہیں، اور نہ کوئی کتابِ الٰہی ایسی رکھتے ہیں جس میں یہ بات کہی گئی ہو، تو اس سے بڑی جہالت و حماقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ محض ہوائی باتوں پر ایک دینی عقیدہ قائم کر لیا جائے اور خداوندِ عالم کی طرف ایسی باتیں منسوب کی جائیں جو صریحاً مضحکہ انگیز ہیں۔